اداریہ

امریکی سامراجیت اور مسلمان

پروفیسر ڈاکٹر انیس احمد

جمہوریت اور انفرادی آزادی کو جدید مغربی تہذیب میں وہی مرکزی مقام ہے جو ایک مسلمان کے عقیدے میں اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے خاتم النبیین ہونے کا ہے۔ جس طرح ایک مسلمان ان دو صداقتوں کے بغیر صاحبِ ایمان نہیں ایسے ہی مغربی تہذیب ان دو اکائیوں کے بغیر اپنا وجود اور تشخص کھو بیٹھتی ہے۔ اکیسویں صدی میں مغربی تہذیب کے اس عقیدے میں دعویٰ کی حد تک تو کوئی بنیادی تبدیلی واقع نہیں ہوئی لیکن عملی طور پر مغرب جدید بلکہ مابعد جدیدیت مغرب (post modern West) کا جو چہرہ ۱۱/۹ کے بعد منظر عام پر آیا ہے وہ اس عقیدہ کی مستند طور پر عملی تردید کرتا ہے۔ چنانچہ ۱۱/۹ کے بعد امریکہ نے جمہوریت اور انفرادی آزادی، دونوں کی دھجیاں اڑا دیں۔ امریکی شہریوں کو ملکی سلامتی کے نام پر غیر معین مدت کے لیے زیرِ حراست کر لینا، ڈرانا دھمکانا ایک معمول بن گیا اور جمہوریت کی جگہ امریکی سامراجیت اور سلطنت کے فروغ کے لیے قوت کا استعمال نہ صرف مباح بلکہ ضروری قرار دے دیا گیا۔

جدید سامراجیت کے لیے یہ ضروری نہیں کہ وہ جغرافیائی طور پر کسی ملک یا خطے کو اپنے دائرہ اثر میں لے آئے۔ آج عالمگیریت کے زیرِ عنوان سینکڑوں ہزاروں میل دُور بیٹھ کر بھی امریکی سامراجی طاقت قوت، دھونس اور دھمکی کے بل پر کسی بھی ملک پر سیاسی طور پر قبضہ کرنے اور اس کی معیشت، سیاست، معاشرت اور ثقافت کو اپنے رنگ میں رنگنے کو نہ صرف جائز بلکہ انسانیت کی خدمت قرار دینے میں شرم محسوس نہیں کرتی۔ نیا سامراجی نظام ''قبل از قتل قصاص'' کرنے میں نہ صرف کوئی تکلف محسوس نہیں کرتا بلکہ اسے ''عالمی امن''، ''عالمی سلامتی'' اور ''عالمی حریت'' کے قیام اور بقاء کے لیے اپنے اوپر ایک فرض اور قرض سمجھتا ہے۔ چنانچہ pre-emptive strike کا نظریہ ہو یا کسی ملک پر جبراً اور قہراً جمہوریت کے نام

پر اپنے گماشتوں کو مسلط کرنا ہو اپنے لیے ذرائع حرارت وقوت کے حصول کی غرض سے عراق کے تیل کے کنوؤں کو ۳۳ سال کے لیے امریکی اور یورپی یونین کی کمپنیوں کو من مانی شرائط پر دے دینا ہو۔ یہ جدید سامراج ان تمام گھناؤنے جرائم کو عراقی عوام کی نجات دہندگی سے تعبیر کرتا ہے اور عراق کے ۶ لاکھ نہتے شہریوں، بچوں، بوڑھوں اور خواتین کے قتل کو اس مقصد کے لیے مباح بلکہ واجب سمجھتا ہے۔ خرد کا نام جنوں رکھ دینے اور جنوں کو خرد قرار دینے کی اس سے بہتر مثال اکیسویں صدی میں ملنی مشکل نظر آتی ہے۔

جدید مغربی سامراج کے اس متضاد، جابرانہ، آمرانہ اور استحصالی طرز عمل کے پہلو بہ پہلو اسی مغرب میں تعلیم وتربیت پانے والے ایسے غیر مسلم دانشور بھی پائے جاتے ہیں جو اس نئی سامراجیت کو آئینہ دکھانے میں کوئی شرم اور مداہنت محسوس نہیں کرتے۔ دوسری جانب بہت سے مسلم ممالک کے سربراہان امریکہ کے جدید سامراجی اقدامات کی حمایت بلکہ امریکی سامراج کے جرائم کی ذمہ داری اپنے سر لینے کو اپنے لیے باعث افتخار سمجھتے ہیں۔ باجوڑ میں ۸۲ معصوم اور کم عمر طالبانِ علم کے سفاکانہ انداز میں شہید کیے جانے کو اپنے سر لینا جبکہ وہاں کے عینی شاہدوں کے بیان کے مطابق امریکی جنگی ہوائی جہازوں نے اس جرم کا ارتکاب کیا تھا، شکست خوردہ ذہنیت اور طاغوت کے سامنے سربسجود ہونے کا ایک واضح ثبوت کہا جا سکتا ہے۔ یہ بے ضمیر افراد طاغوت کے سامنے سجدہ ریز ہونے کو اپنی معراج تصور کرتے ہیں اور دوسری جانب ایسے امریکی غیر مسلم دانشور ہیں جو امریکہ کی سامراجیت کو امن عالم کے لیے ایک مہلک خطرہ قرار دینے میں کوئی جھجک محسوس نہیں کرتے۔ James Putzel جس کا تعلق لندن اسکول آف اکنامکس کے Crisis States Development Research Centre سے ہے یہ کہنے میں باک محسوس نہیں کرتا کہ امریکہ کی حالیہ پالیسی خصوصاً بش کا نظریۂ پیشگی ضرب (Pre emptive strike) بین الاقوامی قانون کی دھجیاں اڑانے اور شہری آزادیوں کو نیست ونابود کرنے کی ایک آمرانہ کوشش ہے*۔

اس طرز فکر کی نشاندہی بہت سے دیگر مغربی دانشور اور محقق بھی کر رہے ہیں۔ مثلاً یونیورسٹی آف نیبراسکا، کینیڈا میں سیاسیات کے معروف پروفیسر ڈیوڈ پی فورسیتھ (Daivd P. Forsythe) اپنے

---

* James Putzel, "*The New U.S Imperialism and Possibility for Coexistence*", Discussion Papers No.2, Development Research Centre, London School of Economics, Jan 2004, p.3-4.

*U.S Policy towards Enemy Detainees in the "War on Terror" مقالہ میں امریکی مظالم اور جرائم کا مقابلہ فرانس کے سامراجی دور میں الجزائر میں کیے گئے مظالم سے کرتا ہے اور امریکی تشدد اور حقوق انسانی کی خلاف ورزیوں کی شدت سے مذمت کرتا ہے۔

آج جب امریکی سامراج کے بعض نمک خوار دوسروں کے جرائم کو اپنے سر لے کر اپنی وفاداری ثابت کرنے کے درپے ہیں، یونیورسٹی آف ایریزونا کے پروفیسر Richard M. Eaton کا مضمون جو ۱۳ اکتوبر ۲۰۰۲ء کے London Review of Books میں طبع ہوا ہے، عراق پر امریکی جارحیت کے پس منظر کو واقعاتی دلائل کی مدد سے امریکی حکومت کے ذمہ دار افراد کے اسماء گرامی کے ساتھ ہمیں بتاتا ہے کہ بش کی کابینہ کے افراد اور بعض فکری اداروں سے وابستہ ماہرین نے کس طرح اپنے ہاتھ تاپنے کے لیے کے لیے عراق میں آگ بھڑکائی۔ وہ ''نئی امریکی صدی'' کے منصوبے کے مصنفین اور کرداروں کی نام بنام نشاندہی کرنے کے بعد امریکہ اور اسرائیل کی ساز باز اور عراق پر حملے کے محرکات وغیرہ پر کھل کر بحث کرتا ہے اور واضح الفاظ میں مشرقِ وسطیٰ میں امریکہ کی خواہش کے مطابق نئے نقشے کے مطابق ممالک کی بندر بانٹ پر روشنی ڈالتا ہے۔ اتنی واضح اور مصدقہ معلومات کے باوجود بعض افراد کا چچا سام کی تسبیح پڑھنا اور برائے شگون کے لیے بچی کھچی عزتِ سادات کو بھینٹ چڑھانا ان کی عدم بصارت، عدم بلوغ اور فارغ الذہن ہونے کا ثبوت پیش کرتا ہے۔ بہت عرصہ قبل کسی مستقبل شناس نے صحیح کہا تھا کہ ہوئے تم دوست جس کے دشمن اس کا آسماں کیوں ہو؟ جو بذاتِ خود چراغ سے اپنے دامن کو آگ لگانے پر رقص مسرت میں مصروف ہو اس کے آشیانہ کو کسی بیرون پتنگے کی کیا ضرورت!

ایک اور امریکی دانشور John Mueller معروف علمی جریدے Foreign Affairs کے اکتوبر ۲۰۰۶ء کے شمارے میں امریکی اور امریکہ کے طفیلیوں کے ''دہشت گردی'' کے نعرے کا پول کھولنے کے ساتھ امریکی شہریوں سے وصول کردہ ٹیکس کا دہشت گردی کے نام پر بے دریغ خرچ اور عملاً تمام حفاظتی اقدامات کے غیر موثر ہونے کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ گھر میں پروردہ دہشت گردوں سے کیسے نمٹا جائے اور کس طرح امریکی پالیسیوں کے نتیجے میں مسلسل دہشت گردوں کی پیدائش اور فروغ کو روکا جائے، ایسے

* Daivd P. Forsythe, *United States Policy towards Enemy Detainees in the "War on Terrorism"*, Human Rights Quarterly, The Johns Hopkins University Press, 28:2 (2006), p.465-491.

سوالات ہیں جن کا جواب وہ اقدامات نہیں دے سکتے جو امریکہ نے اختیار کیے ہیں۔ عراق میں خود امریکی مبصر فرید ذکریا کے بقول ۷۰ فیصد سے زائد عراقی آج امریکیوں کو قتل کرنا پسند کرتے ہیں۔ حالیہ سانحۂ صدام نے اس امریکہ دشمنی میں کئی گنا اضافہ کر دیا ہے اور آج ان حقائق کا اظہار خود امریکی مفکرین جس کثرت سے کر رہے ہیں اس سے تین نکات واضح ہو کر سامنے آتے ہیں۔ اولاً، امریکہ کی سامراجی اور شاہانہ (imperialist) پالیسی کے باوجود بہت سے امریکی ضمیر کی آواز کو دبائے بغیر امریکی پالیسی کی مخالفت میں زبان و قلم کا استعمال کر رہے ہیں جبکہ امریکہ کے وفادار مسلم حکمران امریکہ کے ہر ظلم اور آمرانہ فعل کو حق بجانب سمجھتے ہوئے اس کی حمایت ورنہ کم از کم منقار زیر پر رکھنے میں اپنی عافیت سمجھتے ہیں۔ ثانیاً، دیوار کی تحریر یہ بتا رہی ہے کہ امریکی شہنشاہیت اور سلطنت زوال کے گرداب میں پھنس چکی ہے اور امریکی باشعور آبادی اس کی جارحانہ عالمی سیاست سے بیزار ہو چکی ہے۔ ثالثاً، یہ بات بھی واضح طور پر سامنے آئی ہے کہ امریکہ اور یورپ میں مقیم مسلمانوں کے لیے کم از کم آئندہ دو عشرے مزید آزمائش اور ابتلاء کے ہیں۔ مذہبی منافرت اور تفریق میں اگر اضافہ نہیں تو کمی کے واقع ہونے کے امکانات بھی روشن نظر نہیں آتے۔ ان حالات میں مسلمانوں کا امریکہ اور یورپ کو چھوڑ کر واپس اپنے آبائی وطنوں میں آنے کا خیال اس مسئلہ کو حل نہیں کر سکتا۔

مسئلہ کا اصل حل اسلام کی جامع اور کامل تصویر کا خود مغرب کی زبان و اسلوب میں پیش کرنے اور ان تعلیمات پر عمل پیرا ہو کر یہ ثابت کرنے میں ہے کہ اسلام ہر ظلم اور زیادتی کے خلاف جہاد اور ظلم کو مٹا کر حقوق انسانی کی سربلندی کا قائل ہے اور عالمی انسانی برادری کی بقائے باہمی کی غرض سے عالمگیر اخلاقی اصولوں پر مبنی معاشرہ اور ریاست کا قیام چاہتا ہے۔ مذہبی منافرت، نسلی تعصب اور رنگ کی بنیاد پر تفریق کو رد کرتے ہوئے تمام انسانوں کو نسلِ آدم ہونے کے تعلق سے عالمگیر اخلاقی اصولوں کے احترام کی دعوت دیتا ہے۔ اسلام سامراجیت، آمریت اور شہنشاہیت کو رد کرتے ہوئے انسانوں کو حریت، عزت نفس، وقار اور معروف کی طرف بلاتا ہے اور اس سے قطع نظر کہ سامراجیت کا ارتکاب مغرب کر رہا ہو یا مشرق، طاغوتی طرز عمل کسی سیاہ فام فرد نے اختیار کیا ہو یا سیاہ قلب والے سفید نسل کے فرد نے، وہ ہر باطل اور طاغوتی عمل سے اپنی براءت کا اظہار کرتے ہوئے نسل آدم کو اس عہد کی یاد دلاتا ہے جو اس کی تخلیق کے وقت خالق نے

لیا تھا کہ تمام انسانوں کا رب صرف اور صرف ایک مالک اور خالق اللہ ربُ العالمین ہے، جو عادل ہے اور چاہتا ہے کہ اس کے بندے بھی عدل کو اختیار کریں۔

یورپ و امریکہ میں مقیم مسلمانوں کو بالخصوص اور دیگر مقامات پر مسلمانوں کو بالعموم اسلام کی تعلیمات پر پورے اعتماد اور بلا کسی معذرت پسندانہ رویہ کے اسلام کے اصلاحی طرزِ عمل، ظلم اور فتنہ وفساد کے خلاف جہاد اور غریب کے استحصال کے خلاف جدو جہد کو مناسب انداز میں اپنے طرزِ عمل سے واضح کرنا ہوگا جس کے نتیجہ میں ایک طویل عمل کے بعد مسلمانوں اور اسلام کے بارے میں مغرب کے قائم کردہ تصورات کی اصلاح اور مغرب کے طرزِ عمل میں مثبت تبدیلی واقع ہوگی۔ آنے والے وقت کو اس نقطۂ نظر سے دعوت کی صدی کہا جاسکتا ہے۔

ابلاغِ عامہ کے انقلاب اور عالمگیریت کی موجودگی میں دعوت بالحال اور دعوت بالقال کے ذریعہ ہی اس ذہنی تصویر کو بدلا جاسکتا ہے جو اسلام کے رنگ آلود تصور کی بنا پر مغرب اور مغرب زدہ ذہنوں میں جگہ پکڑ چکی ہے۔

وقت کے اس موڑ پر جب غیر مسلم امریکی اور یورپی دانشور، خود امریکہ کی سامراجیت کے خلاف آواز اٹھا رہے ہیں۔ تحریکاتِ اسلامی کی قیادت کا فریضہ ہے کہ وہ عدل وتوازن کے ساتھ اسلام کے تعمیری کردار اور مغرب کی رو بہ زوال اخلاقی صورت حال کے تناظر میں ایک تہذیبی مکالمہ کے ذریعہ صورت حال کو سنبھالنے اور بہتر بنانے کے لیے اپنا کردار ادا کریں۔ اس تہذیبی مکالمے کا مقصد اپنی ثقافت، دین، اور اپنے تصورِ حیات کو اعتماد کے ساتھ اور بلا خوف پیش کرنا ہونا چاہیے تاکہ دوسرا فریق اسلام کے پیش کردہ متبادل نظریۂ حیات پر غور کر سکے، اس کے خدوخال کو سمجھ سکے اور پوری آزادی کے ساتھ اگر چاہے تو اسے اختیار کر سکے۔

اس شمارے کے مضامین کے انتخاب میں فضاء فاطمہ اثر نے ہمارے ساتھ جو تعاون کیا ہے ہم اس کے لیے شکر گزار ہیں۔ مغرب اور سلام کے ادارتی عملہ میں تین نئے رفقاء کا اضافہ ہوا ہے، ہم فیاض خان، اور پروفیسر اے ڈی میکن اور محمد سلیم ظفر کو خوش آمدید کہتے ہیں اور سید راشد بخاری جو گزشتہ کئی سال سے ہماری معاونت کرتے رہے اور اب ادارہ سے وابستہ نہیں ہیں، ان کی سابقہ مساعی پر اللہ تعالیٰ سے بہترین اجر کی دعا کرتے ہیں۔